

# اسلام پاکستان میں

☆ پروفیسر شیخ محمد عثمان

اسلام پاکستان میں نہایت اہم اور دلچسپ موضوع ہے اور اس کے کئی پہلو ہیں۔ میں یہاں اس کے صرف دو مین پہلوؤں ہی سے بحث کروں گا۔

①

سب سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہو گا کہ ہماری آبادی کے مختلف طبقے اسلام کے بارے میں کیا ذہنی رویہ (ATTITUDE) رکھتے ہیں۔ بلاشبہ ملک کی ہماری اکثریت اسلام کی دلدادہ اور شفیقہ ہے۔ دیہات میں بسنے والے پاکستانی اسلام کے بارے میں تفصیلاً بہت کم جانتے ہیں، اسلامی اصولوں اور ضابطوں پر ان کا عمل بھی شاید کسی معیار پر پورا نہیں اُرتتا، بہت سے مرد اور عورتیں مختلف نوع کی توہم پرستی کا شکار بھی ہیں، ان میں اسلام کی انقلابی روح، اور زندگی کو بہتر اور بہتر بنانے کی اسلامی تڑپ بھی موجود نہیں، جہالت اور ناخواندگی ان کے اور اسلام کی سچی تعلیمات کے درمیان ایک دیوار بن کر کھڑی ہے، یہ سب باتیں اور سب کمزوریاں اپنی جگہ پر تسلیم، مگر یہ امر بھی ایک اہم حقیقت ہے کہ پاکستان کے یہ عوام، جن میں دیہات کی تمام کی تمام آبادی در چند جاگیر دار گھرانوں کو چھوڑ کر، اور شہروں میں بسنے والے مزدور اور دوسرا "نچلا" طبقہ شامل ہے، اسلام سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں۔ ان کے گہرے جذبات کو صرف اسلام ہی اپیل کر سکتا ہے۔ اور ان کے نکر و عمل کے جوہر میں فقط اسی کے نام سے حرکت پیدا ہوتی ہے۔

ان کے ایمان میں بے شک بصیرت اور بصارت، روشنی اور حرارت نہیں ہے، مگر اس میں اول درجے کی وابستگی اور استواری پائی جاتی ہے۔ ان میں اسلامی تعلیمات کا فہم نہیں ہے لیکن اسلامی روایات اور قرونِ اولیٰ کی روح ان کے لاشعور میں اسی طرح سمائی ہوئی ہے کہ ان کی شخصیتوں کا جزو و اعظم اسلام ہی ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جس میں کئی علم و معلومات کے باوجود میرت رسولؐ کے واقعات اور خلفائے راشدین کے حالات

آج بھی افراد اور اعمال کے نیک و بد کا معیار ہیں۔

یہ لوگ اسلام کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کرتے اور دل کی تمام گھبراہٹوں کے ساتھ چاہتے ہیں کہ ہمارے ہاں صحیح اسلامی معاشرہ وجود میں آئے اور باقی تمام دنیا میں بھی اسلام کا بول بالا ہو۔ ہمارے درمیانے طبقے میں شہروں کا درمیانہ پڑھا لکھا طبقہ، خواندہ یا نیم خواندہ خوش حال کاروباری لوگ، درمیانے درجے کے سرکاری اور غیر سرکاری افسر اور اسی معیار کے دوسرے افراد اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے میٹرک طلبہ شامل ہیں۔ مجموعی لحاظ سے دیکھا جائے تو اس طبقے کے اسلامی جذبات قریب قریب عوام کے اسلامی جذبات سے ملتے جلتے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ اس طبقے کے کچھ افراد اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کی تاریخ کا قدر سے بہتر فہم رکھتے ہیں اور کہیں کہیں ان میں تنقیدی نظر بھی پائی جاتی ہے۔ اس طبقے کا زیادہ باشعور عنصر اسلام پر مکی اور بعض صورتوں میں غیر مکی زبانوں میں شائع ہونے والی کتابیں بھی پڑھتا ہے، دوسرے اسلامی ملکوں کے حالات اور رفتار ترقی سے بھی کچھ دلچسپی رکھتا ہے اور اپنے معاشرے کا عوام کی نسبت بہتر اور پُر جوش نقاد ہے۔ اس طبقے کے بعض افراد جو کاروباری ترقی میں مہمک اور جائز و ناجائز ذرائع سے روپیہ کمانے کی دوڑ میں مصروف ہیں، رفتہ رفتہ اسلام اور اسلام کی ترقی سے بیگانہ ہو رہے ہیں، نہ اس لئے کہ اسلامی تعلیمات پر ان کا ایمان اٹھتا جا رہا ہے بلکہ اس لئے کہ ذمیوں لذتوں کا میدان ان کے سامنے یوں کھلا ہے کہ انہیں کسی اور چیز میں دلچسپی لینے کی فرصت میسر نہیں آتی۔

اس طبقے کی اکثریت میں اتنی جان، اتنی جستجو اور اس قدر ذوق عمل ضرور ہے کہ اسلام کے نام پر جب کوئی تحریک اٹھتی ہے یا کوئی داعی اسلام کے نام پر ان کو اپنی طرف بلاتا ہے تو یہ اپنی طبعی پیاس اور توانائی کے باعث اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور اگر کسی "حلقے" میں شریک ہو جائیں تو اپنی استطاعت کے مطابق اور بعض اوقات استطاعت سے بڑھ کر اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد سے اس طبقے کے بے شمار افراد کو اسلامی تحریکوں اور ان کے داعیوں سے سخت مایوسی ہوئی ہے، اور ان کے مخلصانہ جوش عمل کو شدید حد سے پہنچے ہیں، اس کے باوجود یہ طبقہ ہمیشہ کی طرح آج بھی سخت جان اور تازہ دم ہے، اور کسی بھی نئی دعوت پر لبیک کہنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کر سکتا ہے۔

اس طبقے کی اکثریت بھی یہ چاہتی ہے کہ ہمارے ملک کا سیاسی اور معاشرتی نظام جس میں تعلیمی اور

معاشری نظام بھی شامل ہیں، اسلامی اصولوں کے مطابق چلایا جائے اور نئی نسل کو ان اصولوں کا بہتر فہم دیا جائے۔

اب ہم اپنے مطالعے کے ایک مشکل اور نازک مرحلے میں داخل ہوتے ہیں اور ملک کے 'اعلیٰ' طبقے کا جائزہ لیتے ہیں۔

ادپر کے طبقے میں اعلیٰ سرکاری حکام، چوٹی کے جاگیردار، ملک کی تجارت اور صنعت پر چھائے ہوئے سرمایہ دار گھرانے، اور وہ دانش ور شامل ہیں جو ادب یا سائنس کی اعلیٰ تعلیم پانے کے بعد ملک کے 'ماہرین' کے زمرے میں شریک ہو چکے ہیں۔ ان میں یورپی درسٹیوں کے پروفیسر، مقتدر اخباروں کے مدیر، آرٹس اور سائنس کونسلوں کے ذمی اثر عہدے دار اور وہ چند مصنف اور فن کار بھی شامل ہیں جو کسی عہدے کے بغیر محض اپنے کام یا مراسم کے باعث ممتاز ہیں۔

اس طبقے کے مختلف افراد اپنے ذہنی ردیوں کے اعتبار سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان کو ایک 'طبقہ' قرار دینا بظاہر ایک جسارت معلوم ہونی چاہیے۔ تاہم ہماری زندگی میں اقتدار اور متول کی قدر اس قدر مؤثر قدر ہے کہ جب تک ہمارا معاشرہ اپنی موجودہ صورت پر قائم ہے، اس قدر مشترک کے حامل تمام عناصر معاشرہ کو خواہ بعض ذہنی ردیوں کے اعتبار سے وہ کتنے ہی مختلف بلکہ متضاد کیوں نہ ہوں، واقعاتی لحاظ سے انہیں ایک ہی طبقہ قرار دینا چاہیے۔ اس فعال اور ذمی اثر طبقے کو پیش نظر مطالعہ کے اعتبار سے میں چار حصوں میں مزید تقسیم کرنا چاہوں گا۔

پہلا حصہ وہ ہے جو شعوری یا نیم شعوری طور پر اسلام اور اسلامیت سے ایک ذہنی بُعد رکھتا ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جو اس ضمن میں بے تعلق (INDIFFERENT) یا غیر جانبدار ہے۔

تیسرا وہ جو اسلام سے ایک گونہ جذباتی لگاؤ اور اس کی حقانیت اور سچائی پر اعتقاد تو رکھتا ہے مگر اس کے لئے کوئی قدم اٹھانا یا کسی تحریک کا ساتھ دینا ضروری خیال نہیں کرتا۔ اور

چوتھا حصہ وہ ہے جو اسلام کے بارے میں ایک مثبت یقین رکھتا ہے اور اسلام کے نام پر جو کاموں طرف نعرے بلند ہوتے ہیں ان کی گونج سے اپنے دل میں ایک احساس ذمہ داری اور بعض

اوقات احساس جرم محسوس کرتا ہے۔ اور اس ضمن میں تھوڑی بہت تنگ و دو کا بھی آرزو مند ہے لیکن اس راہ کی مشکلات دیکھ کر اور مناسب رہنمائی نہ پا کر اپنے آپ کو بڑی حد تک بے بس پاتا ہے۔

اب میں ان عناصر کا قدرے تفصیل سے ذکر کرتا ہوں۔

اس بات کا اعتراف کرنے میں ہمیں کچھ باک نہیں ہونا چاہیے کہ ہمارے ملک کی "مسلمان آبادی کے اعلیٰ طبقے کا ایک حصہ مختلف وجوہ سے اسلام کے ساتھ کچھ بدمردی نہیں رکھتا۔ میرا خیال ہے یہاں سب سے پہلے اُس طبقے کا ذکر کرنا چاہیے جو جدید مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کے زیر اثر اسلام سے دور ہوا ہے۔

ہمارے کچھ نہایت پینیر حکام جنہوں نے پاکستان بننے سے پہلے بد تعلیم کے ساتھ جدید ذوق نظر اور مغربی مذاق زندگی کو بھی اختیار کر لیا تھا، اور اپنی محنت اور قابلیت کے باعث آزادی سے پہلے مقابلے کے امتحانوں میں کامیاب ہو کر ایک خاص ذہنی افتاد کے مالک بن چکے تھے، اپنی پُر وقار اور اسلام بیزار ذہنیت کے ساتھ ہمارے حصے میں آئے۔ اس طبقے کے زیر اثر یا اس کے حلقہ اثر سے باہر کچھ نوجوان افسر جن میں بعض سنجیدہ علمی مذاق بھی رکھتے ہیں، ایک خاص طرز زندگی کے دلدادہ ہونے کے باعث اور کچھ اُن مواقع کی بدولت جو انہیں امریکہ یا انگلستان میں اعلیٰ تربیت پانے کی غرض سے میسر آئے، وہ مذہب لہذا اسلام سے دور ہو گئے۔ اس کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس طبقے کو نہ صرف اسلام سے بلکہ ہمارے ماضی قریب کی تاریخ، تحریک پاکستان اور اقبال اور قائد اعظم جیسی رہنما شخصیتوں سے بھی کچھ تعلق خاطر نہیں ہے۔ اقتدار کی آسائش اور معاشی بے فکری اور خوشحالی نے ان کو (بقول ان کے) عمی اور واقع پسند (MATTER OF FACT) بنا دیا ہے !!

ہمارے ادیبوں اور شاعروں اور فن کاروں کا ایک حصہ بھی اس طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ بد قسمتی سے پاکستان کی تحریک عوام میں اپنی بے پناہ مقبولیت کے باوجود آزادی کے ذرا پہلے کے دور کے ترقی پسند ادیبوں اور اس قبل کے دوسرے دانش وروں تک براہ راست نہ پہنچ سکی تھی۔ بعض نیشنلسٹ علماء کی طرح ہمارے یہ ادیب اور فن کار بھی قائد اعظم کی زیر قیادت مسلمانان برصغیر کی سیاسی اور ثقافتی جدوجہد کو اس کے صحیح مناظر میں دیکھنے سے قاصر رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی کے ساتھ پاکستان اور تجارت میں آبادیوں کے انتقال کے لئے جو فضا پیدا ہوئی، اُس کے بہاؤ اور دباؤ میں بے شمار دانش ور ذاتی تحفظ کی غرض سے پاکستان تو چلے آئے تھے، لیکن ان کے ذہنوں کا انتشار دور نہ ہوا تھا۔ دوسرے لفظوں میں ان کے جسموں نے تو فروز تانہ مسلمانان کا بادہ اُڑھ لیا لیکن ان کے دل دماغ کی "نامسلمانان" جوں کی توں رہی۔ برسوں بعد گزشتہ ستمبر کی جنگ نے البتہ ان میں سے اکثر کو ایک نئے جذباتی کرائسس (CRISIS) سے دوچار کر دیا۔ اور پہلی بار انہیں

”والفلس وروں“ کے افق نظر پر حقیقت کو جھلملانے کی اجازت ملی۔ میرا خیال ہے جنگ کے واقعات نے ان میں سے اکثر کو اسلام کے لئے جیت لیا ہے !!

پھر خاصے دولت مندوں کا وہ طبقہ ہے جو دولت کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم سے بھی بہرہ مند ہے، ان کا ذوق جمال، ان کی آزاد روی اور ان کا منطقی تعیش قدم قدم پر اسلام سے ٹکراتا ہے۔ اور اگر شعوری طور پر نہیں تو لاشعوری طور پر اسلام کے نام پر بلند ہونے والا ہر نعرہ ان کے جسم و روح پر خون کی ایک نحیف سی لہر طاری کر دیتا ہے۔ اس ذہنی کیفیت میں آزاد روی کے علاوہ ان کی مفاد پرستی کو بھی برابر کا دخل ہے۔ بے تعلق گروہ کی بھی کئی شاخیں ہیں۔ کچھ لوگ ’بادتاز زندگی بسر کرنے کی دوڑ میں اپنے انہماک کے باٹھ ذہنی مسائل میں پڑنے کو بے ضرورت اور تضحیح اوقات خیال کرتے ہیں۔ کچھ لوگ سائنس، فلسفہ، یا خود مذہب کے مطالعہ میں سنجیدگی اور سوچ کے اُس مقام پر جا پہنچتے ہیں جہاں مذہب میں دلچسپی قدرتا بہت کم یا بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ تاہم یہ بے حد محدود سا طبقہ اسلام سے اپنی بے تعلقی کے باوجود بالعموم ایسی اخلاقی اور انسانی قدروں کا حامل ہے کہ معاشرے کے بے شمار دوسرے گروہوں سے بہتر قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن بعض لوگوں کی بے تعلقی، سطحی مطالعہ اور سرسری علم کے باعث پیدا ہوتی ہے۔ اور ان کی یہ روش ہمارے معاشرے بالخصوص نئی نسل کے لئے ایک منفی اثر کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمساری یونیورسٹیوں اور کالجوں میں انگریزی، سائنس، فلسفہ اور نفسیات کے چند اساتذہ یہ ناقابل رشک کردار ادا کر رہے ہیں۔

دی اثر طبقے کا تیسرا گروہ بعض نہایت سینئر سرکاری حکام، تجربہ کار سیاسی رہنماؤں اور ملک کے کچھ ممتاز دانشوروں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ اپنی جگہ پر سچے مسلمان ہیں۔ اسلام کے اصولوں کو ذاتی زندگیوں میں برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ملازمت کی مجبوریوں، سیاسی زندگی کی مصلحتوں یا پھر اپنی طبیعت کی جتنی قدرتی آسانی کے باعث ان کا ایمان دوسروں کے لئے مشعل راہ نہیں بن پاتا۔

چوتھے اور آخری حصے میں پھر کچھ اعلیٰ سرکاری حکام، کچھ سیاست سے تعلق رکھنے والے افراد، کچھ تعلیم کے پیشے سے وابستہ اُستاد اور کچھ ادب و صحافت کے شہرت نصیب حضرات شامل ہیں۔ ان لوگوں کی مختصر ذہنی کیفیت یہ ہے کہ یہ اسلام کی سچائی اور حقانیت کے دل سے قائل ہیں اور اصلاحی قدروں کی تردید کے آرزو مند۔ ان کی یہ آرزو اور ان کا جذبہ ایمانی ان کے اندر عمل کی خواہش بھی پیدا کرتا ہے۔ لیکن جدید

زندگی کی پُر تپج راہوں میں کسی سچے اور قابلِ اعتماد رہنما کے بغیر ان کے قدم آگے نہیں بڑھتے، اور ان کی نگاہیں  
دور تک دیکھنے سے قاصر ہیں !

مجموعی لحاظ سے دیکھا جائے تو اسلامی تعلیمات میں سچی اور دولہرا انگیز قیادت کا فقدان ملک کے سبھی  
طبقتوں کی وقت (HADICAP) اور محرومی ہے۔

(۲)

اوپر کا تجزیہ ملک کی امام آبادی سے تعلق رکھتا تھا۔ اب میں اُن حضرات کے بارے میں کچھ عرض  
کروں گا جو آزادی کے بعد سے اس ملک میں خصوصیت سے اسلام کے داعی ہوئے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس مطالعے میں میں اُن بزاروں نیک نفوس کا ذکر نہیں کروں گا جو دینی مدرسوں میں درس  
دینے، ملک کی لاتعداد مساجد میں وعظ کرنے یا اُس انداز سے رُشد و تبلیغ کے فرائض انجام دینے میں  
مصروف ہیں جو آزادی سے پہلے بھی ملک میں رائج و عام تھے۔ میں یہاں صرف اُن اربابِ فکر و قلم کی  
سرگرمیوں کا جائزہ لینا چاہتا ہوں جنہوں نے پاکستان بننے کے بعد جدید مسائل کا سامنا کرتے ہوئے اسلامی  
تعلیمات کا کوئی خاص شعور ملک کی آبادی میں پیدا کرنے کی نمایاں کوشش اور تحریک کی ہے۔

کڑی نظر سے دیکھا جائے تو صرف تین حضرات یہاں زیرِ بحث آ سکتے ہیں :-

سید ابوالاعلیٰ مودودی، غلیفہ عبدالحمیم مرحوم اور جناب غلام احمد پڑویز۔

لیکن اس بحث کو چھڑنے سے پہلے میں تمہیداً ایک بات بیان کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں، جب سے

ہم جدید مسائل سے دوچار ہوئے ہیں، یا دوسرے لفظوں میں جب سے برصغیر کے مسلمانوں کا جدید مغربی  
تہذیب اور یورپ کے سیاسی تفوق سے تصادم ہوا ہے، اس صورتِ حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم  
نے تین بنیادی انداز ہائے نظر پیدا کئے ہیں۔

پہلا اندازِ نظریہ ہے کہ جدید کوسرے سے تسلیم ہی نہ کیا جائے۔ زندگی کی اصل بیج آج بھی وہی ہے جو  
چودہ سو سال پہلے تھی۔ جس طرح ہمارے بزرگ صدیوں سے زندگی بسر کرتے آئے ہیں اور اسلام کے اصولوں  
پر سختی سے کار بند تھے اسی طرح ہم کو بھی قائم رہنا چاہیے۔ جدید کو سمجھنے کی ہر کوشش منہمکت کا پیش خیمہ  
ہے اور ہمارے موقف سے ہٹانے کا باعث ہوگی۔

دوسرا اندازِ نظریہ ہے کہ تعظیم کی کوئی اہمیت اب باقی نہیں رہی۔ زندگی دم بدم بدلنے والی اور

ہر لحظہ آگے بڑھنے والی مسلسل حرکت کا نام ہے۔ جو سکھ کل رائج تھا، آج نہیں ہے، اور جو آج رواں ہے، کل نہیں ہوگا۔ ماضی کی طرف دیکھنا زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے کا نام ہے! جو حاضر ہے قابلِ توجہ ہے۔ جو حاضر نہیں قابلِ التفات نہیں۔ اسلام کی تعلیمات ابھی سہمی لیکن ان کا دور بیت چکا ہے۔ دوسری قومیں سائنس اور ٹیکنالوجی اور ترکِ مذہب کی بدولت کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہیں۔ ہمیں بھی ان سے سبق سیکھنا چاہیے اور جدید طور طریقوں اور جدید آدابِ زندگی کو اختیار کرنا چاہیے۔ مذہب سے وابستگی زندگی کے ارتقاء میں حائل ہوتی ہے۔

تیسرا اندازہ نظر جو دین اور زمانِ دونوں کے فہم پر مبنی ہے یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات اپنی جگہ پر اٹل حقائق ہیں اور وقت بھی ایک صداقت ہے اور ان میں باہم کوئی تضاد اور تخالف نہیں۔ تضاد اور تخالف اُس دم پیدا ہوتا ہے جب یا تو دین کی حقیقت کو سمجھنے میں ٹھوکر کھائی جائے یا وقت کی واقعیت سے اغماض برتا جائے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اس اندازِ نظر کی رو سے دین فقط خدا کی طرف سے نازل کردہ کتابِ قرآن حکیم اور اُسوۂ رسول پر مشتمل ہے۔ احادیثِ دروایات اور فقہ و کلام و تصوف جملہ جوئے خواہ ان کی انادیت اور فیضِ رسانی کا کچھ بھی درج ہو، دین میں شامل نہیں ہیں۔ اور وقت انسانی علم و شعور کی تبدیلی بیداری کا سہل (SYMBOL) ہے، لہذا دین اور مردِ آیام کے ساتھ منکشف ہونے والے حقائق میں تخالف غیر ممکن ہے۔ اس اندازِ نظر کے علم برداروں کے نزدیک دین کی ایک اہم خدمت یہ ہے کہ ان علمی اکتشافات اور معاشرتی صداقتوں کی طرف سے آنکھیں بند نہ کر لی جائیں جو وقت کے ساتھ ظہور پذیر اور مستحکم ہوتی ہیں بلکہ ان کو اپنی معاشرت میں جذب و اخذ کر لیا جائے۔ کیوں کہ یہ طرزِ عمل دین و حکمت کے بہترین تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو سید ابوالاعلیٰ مودودی پہلے اندازِ نظر سے تعلق رکھتے ہیں، اور اس طبقہ خیال کے نہایت حتمی، نہایت قابل، بڑے پُر جوش اور کامیاب رہنما ہیں۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی کے علمی محاسن میں نمایاں ترین پہلو یہ ہیں کہ وہ جس موضوع پر مسلم اٹھاتے ہیں (اور وہ دین اور زندگی کے تقریباً ہر موضوع پر لکھ چکے ہیں یا لکھ رہے ہیں) اُس کے متعلقات کا مطالعہ محنت اور وقتِ نظر سے کرتے ہیں، اپنے خیالات کو ایک خاص سلیقے اور ہنرمندی سے ترتیب دیتے ہیں اور اظہار و ابلاغ کے فن میں کامل دستِ گماہ کے باعث تحریر کو جاذب، پُر زور اور بسا اوقات اثر انگیز بنا سکتے ہیں۔

ان کے شخصی محاسن میں ان کی غیر معمولی تنظیمی صلاحیت، ان ٹھک قوت کار، اپنی ذات، علمیت، اور اعتقادات پر نہایت پختہ یقین، مستقل مزاجی اور بے غوفی شامل ہیں۔

ان کی شخصی کمزوریوں میں غالباً سب سے نمایاں یہ ہے کہ گذشتہ بیس پچیس برس میں ان کے بیشتر معتد اور مخلص ساتھی ان کی رفاقت سے عاجز آکر ان سے الگ ہو گئے! ہمارے سامنے کی بات ہے کہ سرسید اور قائد اعظم کا جو شخص ایک دفعہ گرویدہ، معتقد یا معتد ہوا، پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس گرویدگی، اعتقاد اور اعتماد بڑھتا ہی گیا اور وہ ان رہنماؤں کے جتنا قریب ہوا، اسی قدر اس کی وابستگی زیادہ ہوتی گئی۔ سرسید کے آخری سالوں میں نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کو بعض امور میں سرسید سے اختلاف رائے پیدا ہو گیا تھا اور اس اختلاف کا اظہار بالخصوص نواب وقار الملک مرحوم نے برملا کیا لیکن سرسید کی شخصی عظمت اور خلوص کا جو نقش اول روزانہ کے دلوں میں بیٹھا تھا وہ آخری دم تک قائم رہا اور اختلاف کے باوجود وہ سرسید کی ذات اور تحریک کے ساتھ تازلیت و ابتر رہے۔ نفسیاتی تجزیے اور دیگر اسباب کی چھان بین کا یہ موقع نہیں، تاہم اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بیشتر ذمی علم معتدان سے بدول ہو کر الگ ہوئے ہیں اور حیثیت مجموعی ان کی تنظیم، سوں پہلے جہاں تھی، آج بھی وہیں ہے بلکہ اس تھوڑے سے عرصے میں وہ جتنے قدم آگے بڑھی ہے شاید اس سے زیادہ اُسے پیچھے کو ہٹنا پڑا ہے۔

پاکستان بننے کے بعد سے اب تک سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جس قدر رسالے، کتابیں اور مضامین لکھے ہیں ان کو سامنے رکھتے تو آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ جدید زندگی کے جس قدر اہم مسائل اس وقت پاکستان کی مسلمان سوسائٹی کو درپیش ہیں، سید صاحب کی ایک ایک پر نظر ہے، لیکن جب آپ ان مسائل کے بارے میں ان کے نقطہ نظر کا تجزیہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کی بیشتر قوت استدلال اور قدرت بیان اس مقصد کے لئے صرف ہو رہی ہے کہ آج کے دور کو اسی فقہ اور فکر کا پابند بنایا جائے جو صدیوں پہلے کے معاشرتی احوال میں ہمارے بعض نیک دل دانشوروں کی بدولت پیدا ہوئی تھی۔

زمین کا مسئلہ ہو یا یتیم پوتے کی درانت کا سوال، تعدد و ازدواج کی بحث ہو یا ضبط و حدود کا موضوع،

اسلامی معاشرے میں عورت کی حیثیت زیر نظر ہو یا آئین سازی کے مسائل، سید ابوالاعلیٰ مودودی کی پُر وقار و متین و مخلص آواز روح عصر اور روح اسلام کے خلاف صدیوں پُرانی فقہ و روایات کی صدائے



بازگشت کے سوا کچھ نہیں !!

دینی مسائل میں غلوس، محنت اور علمیت اور چیز ہے اور نظر و بصیرت اور چیز — دونوں قسم کے محاسن کا آپس میں کوئی تیر نہیں، یہ سب محاسن کسی ایک شخصیت میں بھی جمع ہو سکتے ہیں اور اسلامی فکر کی تاریخ میں بارہا ایک جا بونے ہیں لیکن بارہا ان کی یک جہائی ممکن نہیں بھی ہوئی ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ذات میں بھی یہ یک جہائی ممکن نہیں ہو سکی !

اپنے پر زور قلم، اپنی پُر تاثیر زبان، اپنی غیر معمولی تنظیمی صلاحیت اور ان تک قوتِ عمل کی بدولت سید ابوالاعلیٰ مودودی نے پاکستان کی تاریخ کے پہلے دور میں (جو ابھی جاری ہے) بلاشبہ ہمارے معاشرے کے تقریباً سبھی ضیقوں کو متاثر یا متنبہ کیا ہے۔ لیکن یہ تاثر امدید یا تنباہ کچھ زیادہ تعمیری اور مثبت ثابت نہیں ہوا ہے۔ (اور اس کے دیر پا ہونے کا شاید سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔)

اگر سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنے کا نہ ہوں پر روایات کا بیشتر بوجھ اٹھا کر آگے بڑھنے کی جدوجہد کر رہے ہیں تو جناب غلام احمد پر دیز روایت سے بے تعلق اور بے زاہد دکھائی دیتے ہیں۔ جناب پر دیز کے ان سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مقابلے میں جدید مسائل کا بہتر فہم پایا جاتا ہے۔ انہوں نے آئین سازی سے لے کر معاشرے میں عورت کی حیثیت تک ہر مسئلے پر روایات سے ہٹ کر صرف قرآن حکیم کی روشنی میں غور و فکر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور بہت سے معاملات میں وہ روحِ قرآنی کو پانے میں کامیاب بھی ہوئے ہیں لیکن ان کے مزاج اور طریق کار کے تشدد نے ان کے اثر کو ایک بہت ہی محدود طبقے سے آگے نہیں بڑھنے دیا !

سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مقابلے میں کم سہی تاہم جناب غلام احمد پر دیز میں بھی تنظیمی صلاحیت کی کمی نہیں، لیکن ساتھیوں کے دلائل سے اعتماد یا شوقِ رفاقت کے اٹھ جانے کے جو ساختہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کو دقتاً دقتاً پیش آئے ہیں جناب پر دیز کی زندگی بھی اس سے محفوظ و معصوم نہیں ہے تاہم ان کی تحریک یا کام کے لئے یہ واقعات کچھ زیادہ فیصلہ کن اہمیت نہیں رکھتے۔ ان کے ضمن میں میرے نزدیک فیصلہ کن امور حسب ذیل ہیں۔

اول۔ احادیث کے بارے میں ان کے رویے کی حد سے زیادہ سختی۔

دوم۔ صوفیانہ مشاغل سے بُعد یا بیزاری کے باعث روحِ تصوف ہی کی مخالفت۔

سوم۔ روایات سے انکار کے سبب ماضی کے تمام علمی دینی سرمائے سے انکار۔

چہارم۔ سلف کے کارناموں کے صحیح شعور سے محرومی کے باعث اپنے کام اور کارنامے کا مناسب جڑوں

سے بڑھا ہوا احساس۔

میرا خیال ہے اُدپر کے بیان کی تھوڑی سی وضاحت یہاں بے محل نہ ہوگی۔

(۱) احادیث کے سلسلے میں جناب پر دین کا زاویہ نگاہ شاید غلط نہیں ہے لیکن افراط و تفریط نے معاملے کی صورت بگاڑ دی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ کہنے کو پر دین صاحب کا علمی توقف بھی وہی ہے جو علامہ اقبال یا سرسید احمد خان کا تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ عام مسلمانوں نے جس طرح کار و عمل جناب پر دین کے لئے ظاہر کیا ہے اس نوع کار و عمل سرسید اور علامہ اقبال کے لئے بزرگروں نے نہ ہوا تھا۔ میری رائے میں اس کی وجہ یہ ہے کہ مؤرخ الذکر دونوں بزرگوں کا اس بے حد نازک معاملے میں طرز عمل زیادہ چھینا اور سنی برترت نکاہی اور نفسیات بینی تھا۔ انہوں نے بھی اکثر و بیشتر قرآن ہی سے استدلال کیا، لیکن حدیث کے خلاف کسی مہم کا آغاز کر کے مسلمانوں کی حریت کو ایک نئے اقتراح یا نزع سے دوچار کرنے کا خیال بھی ان کے ذہن میں نہ آسکتا تھا۔

(۲) عجمی اور غیر اسلامی صوفیاء نے مشائخ کے خلاف سرسید اور حالی نے بھی دلی زبان سے آواز اٹھائی، لیکن اقبال نے تو اس سوال کو بڑی شد و مدد کے ساتھ اٹھایا اور اپنی نظم و نشر اور خطوط و خطبات، ہرزو ریح اور ہر وسیلہ سے کام لے کر اُس رنگ تصوف کو مٹانے کی کوشش کی جو اُن کے نزدیک غیر اسلامی اثرات سے مسلمانوں میں رواج پا گیا تھا۔ تاہم جو تصوف اسلام کے اندر پایا جاتا ہے اور اسلامی تعلیمات کا ایک بنیادی جزو ہے، اقبال نے اُس کی کبھی مخالفت نہ کی۔ آپ اُن اشعار کو دیکھئے جو اقبال نے ہمارے عظیم صوفیاء مثلاً مولانا رومی، حضرت علی ہجویری، حضرت میاں میر، حضرت مجدد الف ثانی اور خواجہ نظام الدین اولیاء کے بارے میں لکھے ہیں۔ اُن کے اسلوب زندگی سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ انہیں بزرگان دین سے کتنی عقیدت اور محبت تھی اور صوفیاء سے ملنے کا کیسا اشتیاق ان کے دل میں پایا جاتا تھا۔ وہ بارہا حضرت مجدد الف ثانی، خواجہ نظام الدین اور حضرت علی ہجویری (داتا گنج بخش)

سلسلہ ذکر اقبال، میں مرحوم عبدالمجید سالک نے میاں شیر محمد (شرقیہ) کی خدمت میں علامہ کی حاضری کا واقعہ اور متعدد دوسرے واقعات بیان کئے ہیں۔ ذکر اقبال، ۱۳۱-۱۳۰۔

کے مزارات پر فاتحہ خوانی اور دعا کے لئے اہتمام اور شوق سے گئے۔ مجدد الف ثانی کے مزار پر ان کی واردات و کیفیات کا بیان ان کے صاحب زادے ڈاکٹر جاوید اقبال کے اس مضمون میں بھی موجود ہے جو انہوں نے اپنے عظیم باپ کے متعلق لکھا ہے، اور ملفوظات اقبال مرتبہ محمود نظامی میں شامل ہے۔

مختصر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اقبال جہاں غیر اسلامی تصوف کے شدید مخالف تھے وہاں اپنے سوز و گداز اور قلبی کیفیات کے لحاظ سے خود ایک صوفی اور مسلمان صوفی تھے۔ جناب پرویز نے تصوف کے خلاف اقبال کی لے کو تیز تر اور تلخ تر تو کر دیا لیکن اسلامی تصوف کی جو روح اقبال کے ریشے ریشے میں سائی ہوئی تھی، اس کو نہ دیکھ سکے! نتیجہ یہ ہے کہ قرآن کا وہ حصہ جو خدا اور بندے کے درمیان ذاتی تعلق پر زور دیتا، اور روحانی واردات کا سرچشمہ ہے، جناب پرویز کے ہاں مادی اور معاشرتی تعبیرات کا ایک دل خراش مرتع بن گیا ہے!

(۳) انسانی زندگی کا ایک المیہ یہ ہے کہ مصیبت کی طرح لغزش نکر بھی تنہا نہیں آتی۔ جناب پرویز نے حدیث کے متعلق جب اعتدال کی راہ چھوڑی تو کئی اور راہیں تھی و بصیرت کی خود بخود اُن پر گم ہو گئیں۔ محدثین سے بظنی ان کو شدہ شدہ سلف کے تمام مفسرین اور علمائے کرام سے بدظن کر گئی!۔ ان کے مضامین و رسائل دیکھئے یا ان کے درس کی تقاریر سنیئے آپ کو ان کے لہجے اور انداز میں جا بجا سلف کے قریب قریب تمام کارنامے کی تضحیک کا احساس ہو گا۔

(۴) جب کوئی عالم کسی قوم کی لمبی تاریخ میں خود کو تنہا پائے اور اپنا آپ ہی اس کو دکھائی دے تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ وہ اپنی ذات کے بارے میں کیا اور کیسی رائے قائم کرے گا۔ جناب پرویز کی اکثر تحریروں اور "طلوع اسلام" میں شائع ہونے والے بیشتر مضمونوں سے پڑھنے والا اس تکلیف و احساس سے دوچار ہوتا ہے کہ جناب پرویز کے نزدیک یا تو قرآن حکیم کو خود رسول اکرم کی ذاتِ گرامی نے (اور وہ بھی اپنے دور کی ضروریات کی حد تک) سمجھا تھا اور خلفائے راشدین نے یا پھر صدیوں کے بعد طلوع اسلام کی تحریک نے قرآن کے مطالب کو دنیا پر روشن کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ درمیان میں قرآن نہیں کی کوئی استثنائی صورت ظہور میں آگئی ہو تو اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا (واللہ اعلم بالصواب!)۔

شعر میں تعلق ہمارے ہاں صدیوں سے روا ہے غالباً اس لئے کہ شعر کے پیرائے میں اپنے من سے اپنی تعریف بڑھنے والے کو کھٹکتی کم ہے یا شاعر اگر اظہار پر قادر ہے تو لطف بیان مضمون کے عیب کو چھپا

دیتا ہے لیکن ہماری یہ بھی روایت ہے کہ شاعر جب نثر کا پیرایہ اختیار کرتا ہے تو اس شاعرانہ رعایت سے دست کش ہو جاتا ہے۔ حائاتی اور اقبال دونوں نے شعر کی دنیا میں اپنے کمال فن، اپنے ذاتی جوہر اور اپنے کام کی تعریف میں مضائقہ نہیں سمجھا لیکن ان دونوں بزرگوں کی نثر اٹھا کر دیکھئے کیا مجال جو 'تعلیٰ' کا شائبہ تک پایا جائے۔ یہاں ان کے انکسار کا عالم دیدنی ہے۔ نثر میں ہمارے ہاں صرف یہاں صوفیانہ نثر سے بحث نہیں، ابوالکلام آزاد نے کبھی اشاروں کنایوں میں اور کبھی کھلے بندوں اپنی عظمت اور علم و بصیرت کا داگ چھڑا ہے لیکن وہاں بھی ان کے مزاج کی شوریدگی، ان کی نثر کے شاعرانہ پن اور ان کی زندگی کے ایسے کو دیکھ کر قاری کو ان کی یہ ادا اکثر ناگوار نہیں گزرتی۔ جناب پرویز ٹنڈے سبھاؤ اپنی عظمت بیان کرتے ہیں اور اس کا تاثر ناخوش گوار ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ انتہائی خلوص، سخت جانفشانی اور اعلیٰ تنظیمی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے باوجود تینہ ابوالاعلیٰ مودودی اور جناب غلام احمد پرویز اپنے انداز فکر اور طریق کار کی بعض محدودیوں (LIMITATIONS) کے باعث کوئی گہرا، دیرپا یا ملک گیر تاثر پیدا نہیں کر سکے ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کی کتابیں، رسالے اور مضامین ملک کے طول و عرض میں پڑھے اور پڑھائے گئے ہیں اور پاکستان میں شاید ہی کوئی اہل قلم ایسا ہو گا جو اشاعت اور فروخت (PUBLICATION & SALE) میں ان کا مقابلہ کر سکے۔ تاہم ملک کا ذہن اور دانش ور طبقہ ان کے حلقہ اثر سے باہر رہا ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم اپنی نظر و بصیرت کے اعتبار سے شاید زیادہ کے بعد ملک میں واحد شخص تھے جو اسلامی فکر کی اُس روايت کو تازہ کر سکتے تھے جو سرسید اور اقبال کے بعد کسی محرم اسلام کے انتظار میں چشم براہ اور جاں بہ لب ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم مرحوم جس طرح جدید سے آشنا تھے، اسی طرح قدیم۔ یہ بھی واقف تھے۔ وہ ایک طرف جدید زندگی اور اس کے مسائل کو خوب سمجھتے تھے، اس کے مزاج شناس اور مدد دہ تھے اور دوسری طرف قدیم کے رمز شناس اور اسلامی تعلیمات اور اس کی روح و غنائت کا گہرا ادراک رکھتے تھے۔ ان کے مزاج میں اعتدال، ان کی نظر میں وسعت اور ان کے فکر میں گہرائی تھی۔ عرض جدید زمانے میں اسلامی فکر کی صحت مند اور حیات بخش روايت کو آگے بڑھانے کے منصب کی جس قدر ذہنی، روحانی اور اخلاقی مقصدیات ہیں، خلیفہ عبدالحکیم مرحوم ان میں سے بیشتر کو بہ طریق احسن پورا کرتے تھے لیکن بڑی حد تک ان کے مذاق علمی کے تنوع اور ذوق خوش دہنی نے ادراک حد تک ان کی کم آرزو مندی نے ملے سید سلیمان ندوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کو اگر مہلت ملتی تو ان سے بھی عظیم توقعات وابستہ کی جاسکتی تھیں۔

انہیں اس امر کی اجازت نہ دی کہ وہ اُس کارنامے کو سرانجام دے سکتے جو اپنی ذہنی استعدادوں کی پناہ پر ان کے بس میں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر خلیفہ عبدالحکیم کو سید ابوالاعلیٰ مودودی اور غلام احمد پرویز کا آدھا ذوقِ تنظیم، انہماک اور آرزو مندی نصیب ہوتی تو اسلامی فکر کے میدان میں ہماری پس ماندگی اور افلاس کا وہ عالم نہ ہوتا جو آج ہے !

تاہم خلیفہ مرحوم نے 'اسلام کا نظریہ حیات' لکھ کر اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کی بنیاد رکھ کر ایک ایسا قدم اٹھایا جو گذشتہ اٹھارہ برس کے دوران اس ملک میں اسلامی فکر و ثقافت کے نام پر اٹھنے والے ہر قدم سے زیادہ اہم اور قابلِ قدر ہے اور شاید سیدھی سمت میں تنہا قدم ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی، جناب غلام احمد پرویز اور خلیفہ عبدالحکیم کے بعد مغربی پاکستان کی حد تک چند سوچنے اور لکھنے والے اور میں، جو یہاں قابلِ ذکر ہیں۔ کڑی نظر سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر ایس ایم اکرام نے اسلامی مسائل پر نہیں لکھا، تاہم سلسلہ "کوٹھ" کی کتابیں اور اسلامی ثقافت پر ان کے مضامین اور ان کی تالیف 'پاکستان کے بنانے والے' (MAKERS OF PAKISTAN) اس امر کا ثبوت ہیں کہ وہ جدید اسلام کے مسائل کو بے شمار دوسرے 'مفکرینِ اسلام' سے بہتر سمجھتے ہیں۔ پورانے لکھنے والوں میں پروفیسر محمد سردار، مولانا محمد جعفر ندوی اور مظہر الدین صدیقی کی اکثر تحریریں صحیح شعور اور راست غور و فکر کا پتہ دیتی ہیں۔ قدیم علمی سرمائے کا جدید ذوق و ضرورت کے مطابق جائزہ لینے کا کام اگر کوئی شخص ہمارے درمیان تابلیت اور ذمہ داری کے ساتھ سرانجام دے رہا ہے تو وہ مولانا محمد خلیفہ ندوی ہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم کے بہت سے علمی اوصاف ڈاکٹر فضل الرحمن میں موجود ہیں لیکن یہ دیکھنا ابھی باقی ہے کہ جو مندرجہ موم نے خالی کی ہے ڈاکٹر فضل الرحمن اپنے آپ کو اس کا اہل بناتے ہیں یا نہیں۔

اس حصہ مضمون کے خاتمہ پر مجھے ایک ضروری بات اور کہنی ہے، اور وہ یہ کہ اگرچہ حکومت نے کئی ایک ادارے تحقیقاتِ اسلامی کے قائم کر دیئے ہیں اور ان میں خاصا کام بھی ہو رہا ہے۔ لیکن اسلامی فکر کے میدان میں اس وقت جو خلا پایا جاتا ہے مجھے شک ہے کہ وہ سرکاری یا نیم سرکاری اداروں سے پُر ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے ایک زبردست عوامی تحریک اور عوامی رہنما یا رہنماؤں کی ضرورت ہے جو نہ صرف تعلیماتِ اسلامی کا سچا فہم رکھتے ہوں اور جدید زمانے کی ضروریات سے پوری طرح باخبر ہوں بلکہ تحریک کو منظم کرنے اور قائدانہ صلاحیتوں کے ساتھ اپنے فکر کو مقبول بنانے کا دم خم بھی رکھتے ہوں۔